ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.7,Issue No.1 (2025)
(January to March)

الطاف فاطمہ کے افسانوں میں جنگی سفاکیوں کا شعور

Awareness of Brutalities of War in Altaf Fatima's Short Stories

جویریہ نذیر
پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اُردو زبان واَدب، یونی ورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا
محمد عامر سہیل
لیکچرار، شعبہ اُردو زبان وادب، یونی ورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا

Javaria Nazeer
Ph.D Scholar, Department of Urdu language and literature, University of Sargodha, Sargodha
jawarianazeer97@gmail.com
Muhammad Amir Sohail
Lecturer, Department of Urdu language and literature, University of Sargodha, Sargodha
muhammad.amir@uos.edu.pk

Abstract:
The desire to become the most powerful is inherent in human nature, and atomic bombs were created to win wars and gain that power. Altaf Fatima is a mature short story writer who is well aware of the demands of contemporary circumstances, the purposes of global wars, and the devastating effects of atomic bombs. She also knows the art of informing and sensitizing her readers. How brutally innocent and harmless people are crushed in the pursuit of power. And how the defense of this heinous act is presented to the world. Global powers do not care about anyone but themselves. They have access to all means of buying justice and proving lies to be true, and they instigate nations to hate each other so that they can maintain their dominance. Altaf Fatima has exposed these behind-the-scenes realities through her short stories".

Keywords: Altaf Fatima, contemporary circumstances, sensitizing, Global powers, instigate nations, behind-the-scenes

طاقت سے طاقت ور بننے کی خواہش انسان کی سرشت میں شامل ہے، اسی طاقت کے حصول کی خاطر جنگیں اور انھیں جنگوں کو جیتنے کے لیے سبھی انسانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے ایٹم بم ایجاد کیے گئے ہیں۔ عالمی طاقتیں اپنے مقصد کے حصول کے لیے بے گناہ اور کمزور انسانوں کو کیڑے مکوڑے سمجھ کر کچل دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی ہیں۔ اسی کرب اور پالیسی کو الطاف فاطمہ نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ عالمی طاقتیں دولت کے نشے اور طاقت کے زعم میں اپنے بے جا اور فارغ دماغوں کو مصروف کرنے کے لیے عراق، شام، افغانستان ور فلسطین جیسی غریب اقوام کی سرزمین کو کھیل کا میدان سمجھ کر شطرنج کی بساط پھیلاتی ہیں۔ غریب اور ضرورت مند لوگوں کی ضرورتوں کا فائدہ اٹھا کر انھیں پیادہ بنا کر لڑنے اور مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ طاقتیں اپنے ممالک کو جنت اور ان جیسوں کے ممالک کو جہنم بنانے میں بر سرپیکار مصروف ہیں۔ ان جنگوں میں ان طاقتوں وروں کے ممالک کا نہ انفراسٹرکچر

تباہ ہوا اور نہ ہی ان کے بچوں کا مستقبل داؤ پر لگا۔ تہس نہس تو شام ہوا۔ انفرااسٹرکچر تو عراق کا زمین بوز ہوا اور بچے تو افغانستان کے خون کے لوتھڑوں میں رُل گئے۔ عالمی سیاست میں اخلاقیات اور انسانیت کا پرچار تو کیا جاتا ہے، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اپنے فائدے اور اپنی ضد میں طاقت پر اختیار رکھنے والے ملک اعلانیہ غریب اور کمزور ممالک کو پاؤں تلے کچل دینے کے بعد سچے جھوٹے جواز پیش کر کے اپنے عمل کو Justify کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ پس پردہ حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود چار روناچار لوگ اسی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔

الطاف فاطمہ باشعور افسانہ نگار ہیں اور اپنے قاری کی وہ بصیرت اور سوجھ بیدار کرنے میں کامیاب ہیں، جو اُسے عصری حالات میں زندہ رہنے کے قابل بناتی ہے۔ باشعور لوگ ہی اپنے حق کا دفاع کر سکتے ہیں، وگرنہ سوائے استحصال اور پیروی کے کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے۔ سیاسی شعور موجودہ عہد کا تقاضا ہے۔ جنگ کیوں کر ہوتی ہے؟ اس میں کس کا مفاد چھپا ہوتا ہے؟ اسے کون لڑتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں، جن کا جواب غالباً سبھی باشعور لوگوں کو پتا ہے، مگر وہ حقیقت بتانے سے ڈرتے ہیں یا پھر کھل کر اظہار نہیں کرنا چاہتے۔ "ایٹم بم" انسانیت کا قتل کرنے کی خاطر خود انسانوں نے ایجاد کیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے صرف دشمن ہلاک ہو گا، جب کہ دشمن بھی عین یہی سوچ رکھتا ہے۔ ایک باشعور انسان کے دماغ میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے:

"Was the atomic bomb necessary?"

"کیا ایٹم بم کی ضرورت تھی؟"

Oppenheimer جسے "the father of atomic bomb" کہا جاتا ہے، بھی نہیں جانتا تھا کہ جو وہ بنا رہا ہے، اس کے اثرات کس قدر سنگین ہو سکتے ہیں۔ پہلے ایٹم حملے کے مشاہدے کے بعد اس کے الفاظ یہ تھے:

"I am become Death the destroyer of world". (1)

اس کا نتائج نے خود اس کو دہلا کر رکھ دیا، مگر اب یہ ایجاد ناقابلِ تلافی تھی۔

الطاف فاطمہ کا افسانہ "ذہن کا اقلیدسی زاویہ" عالمی جنگوں کے جنوں اور اقوامِ متحدہ کے کردار پر سوال اٹھاتا ہے۔ ۱۹۸۲ء میں فاک لینڈ پر برطانیہ کا حملہ اور پھر ایسے حملوں سے متاثر ہونے والے بچوں کے لیے اقوام متحدہ کے ادارے یونیسیف کا دوغلہ رویہ ناقابل برداشت ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار مائیکل وولف ہے، جس کے والدین مسز ولما وولف اور مسٹر ٹامس وولف اپنی اپنی زندگیوں میں اتنے مصروف رہے کہ مائیکل کو وقت ہی نہ دے سکے۔ مائیکل کی والدہ اقوام متحدہ میں ملازمت کرتی تھی۔ اس حوالے سے بچوں کی فلاح اور بہبود کے لیے کسی نہ کسی ترقی پذیر ملک کے دورے پر ہی رہتی جبکہ والد مجذوب ہو کر ویران پہاڑی علاقوں میں جا بسا۔ مائیکل کی پرورش اس کی گرینی یعنی "نانی" نے کی۔

الطاف فاطمہ نے اس افسانے میں ایک ایسے ملک کے باشندوں کو موضوع بنایا ہے جو فلسطین کے تنازعہ، عالمی جنگ اور خوراک کو ترسے بچوں کی منافقانہ مدد میں پیش پیش رہے۔ فلسطین کا مسئلہ "نانی" کی ہم نسل کا پیدا کردہ تھا۔ مائیکل کے دوست "اسامہ بن علی" اور "یشام بن غالب" جن کا تعلق ایسے ہی ملکوں سے تھا، مائیکل ان کو جب گھر لے آیا تو "نانی" نے ان کو گھر داخل نہ ہونے دیا۔ نانی کے نزدیک وہ دہشت گرد، ہائی جیکر اور مشتعل انسان تھے۔ "مائیکل" جو نئی نسل کا نوجوان تھا وہ چیخا کہ وہ میرے دوست کو غلط سمجھ رہی ہیں:

"مکی، خدا کے واسطے، یہ سب کے سب دہشت پسند ہوتے ہیں"۔

"مگر گرینی ان کی جیبیں خالی ہیں اور ان کے ہاتھ میں کوئی گرینیڈ نہیں۔۔۔۔۔"

وہ اپنے عہد کے نوجوانوں کی طرح گلا پھاڑ کر بولا تھا۔

۔۔۔"مکی ڈیئر میری بات تو سن لو۔۔۔ یہ ہائی جیکرز ہوتے ہیں۔

"مگر گرینی جان۔۔۔ ہم اس وقت ہوائی جہاز میں سوار نہیں ہیں خدا کے فضل و کرم سے"۔(۲)

"مائیکل" نصرانی تھا اور وہ جانتا تھا کہ فلسطینیوں پر سراسر ظلم کیا گیا ہے لیکن "نانی" اور اس کی نسل ان نہتے فلسطینیوں کو دہشت پسند قرار دے کر اپنے مظالم کا جواز تلاش کرنے کی جستجو میں "مائیکل" حقائق سے واقف نسل سے تعلق رکھنے والا شخص تھا، وہ پچھلی نسل کی سوچ سے مختلف سوچ رکھتا تھا اسی لئے وہ پس پردہ حقائق سے بہت حد تک آگاہ تھا۔

۱۹۸۲ء میں جب برطانیہ نے فاک لینڈ پر بربریت دکھائی۔ نہ جانے کتنے بزرگوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ بیسویں صدی میں ہونے والی جنگوں میں برطانیہ پیش پیش رہا۔ چاہے پہلی عالمی جنگ ہو یا دوسری عالمی جنگ اور فاک لینڈ کی جنگ بھی برطانیہ ہی لڑ رہا تھا۔ "مائیکل" کا تعلق اسی قوم سے تھا وہ قوم جو دوسری اقوام کو نگلنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہے۔ "مائیکل" شرمندہ تھا مگر وہ بے بس تھا وہ یہ سب روکنے کا اختیار نہیں رکھتا اور "نانی" بھی اخباروں کی سرخیاں پڑھنے کے بعد خاموش ہو گئی۔ فاک لینڈ کے بچے صبح سویرے اٹھ کر سکول جانے اور پہاڑے یاد کرنے سے آزاد ہو چکے تھے کیونکہ ٹینکوں نے انھیں بڑی گہری نیند سلا دیا تھا۔ "نانی" جو آج "اسامہ بن علی" اور "یشام بن غالب" کو سوچ کر بہت ہی پشیمان تھی کیونکہ وہ جان چکی تھی کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون ہے اور وہ چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی ولما وولف جو افریقہ اور ایشیاء کے بچوں کی بھوک کو مٹانے کا دعویٰ کرتی تھی اسے فلسطین اور یروشلم کے بچے بھی دکھائی دینے چاہئیں۔ اقوام متحدہ جو ان مظالم کو روکنے کا اختیار رکھنے کے باوجود نہیں روکتی مگر ظلم ہو جانے کے بعد ہمدردی کا ٹوپی ڈرامار چالیتی ہے۔ یہ سوال "مائیکل" کے ذہن میں کتنی بار آیا تھا:

"سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ہم مطلب ہے مسز ولما وولف اقوام متحدہ کسی قسم کی بہبود میں کامیاب ہو سکتے ہیں"۔(۳)

اور

"ان جیسے نہ سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں اور ان کی آنکھوں پر اور دلوں پر پردے پڑ گئے ہیں۔۔۔ اگر دیکھ سکتے یا سن سکتے تو اقوام متحدہ کے سال بہ سال ہونے والے اجلاسوں میں کبھی تو ان ترقی پذیر قوموں کی کوئی بات سنی جاتی۔ اسی طرح کہ کسی مسئلے کا تو حل تلاش کر لیا گیا ہوتا"۔(۴)

اقوام متحدہ کا قیام ۱۹۴۵ء میں دوسری عالمی جنگ کے بعد وجود میں آیا جس کا مقصد دنیا کو آئندہ ہونے والے کسی بھی قسم کے ظلم سے بچانا تھا لیکن اقوام متحدہ کا ادارہ بری طرح اس مقصد کے حصول میں ناکام رہا بلکہ اس ادارے میں صرف طاقت ور اور ظالم کے حق میں فیصلے کیے جاتے ہیں۔ انسانی ہمدردی، ایٹمی بموں کے استعمال پر پابندی، عالمی بچوں کی حفاظت کا ذمہ وہ مکھوٹے ہیں جن کو چہروں پر چڑھا کر ظلم کرنے کے بعد دنیا کا سامنا کیا جاتا ہے۔ درحقیقت فلاحی امداد کی مد میں بھی ان طاقت ور اور مقتدرہ عالمی قوتوں کے مفادات چھپے ہوتے ہیں۔ "مائیکل" اپنی قوم کی ساری حقیقت سے واقف ہے مگر خاموش ہے اور خاموش رہنا اس نے اپنی نانی کی نسل سے ورثے میں حاصل کیا تھا۔ وہ بھی اسی روایت کے مطابق سر عام اور واضح ظلم ہوتا دیکھ کر خاموش تھا۔

ترقی پذیر ممالک اور ترقی یافتہ ممالک کے لوگوں کے اقدار اور خیالات میں بہت فرق ہے۔ الطاف فاطمہ نے "وہ جسے چاہا گیا" افسانے میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملک کے لوگوں کو موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر جم نکولس سینتالیس سالہ صحافت کے پروفیسر تھے اور غیر شادی شدہ بھی تھے۔ "حبیبہ" اور "عذرا" پاکستان سے یورپ پڑھائی کے لیے "جم نکولس" کی بھابی کے گھر میں مقیم تھیں۔ "حبیبہ" بالکل مشرقی لڑکی پر پورا اترتی تھی جبکہ "عذرا" خود کو یورپی ماحول کے مطابق ڈھال چکی تھی۔ مغربی اور مشرقی لڑکیوں میں حیا اور محبت کے معیار میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس بات کا اندازہ ڈاکٹر جم نکولس کو حبیبہ سے مل کر ہوا تھا۔ امریکی لڑکیاں ضرورت سے زیادہ منہ زور ہوتی ہیں جبکہ مشرقی لڑکیاں ضرورت سے زیادہ شرمیلی ہوتی ہیں۔ حبیبہ بھی شرمیلی تھی مگر وہ بہت ہمدرد بھی تھی اس لیے نکولس کو بھوکا دیکھ کر وہ کچن میں گھس گئی تھی حالانکہ اسے سوائے آلو کی سبزی پکانے کے علاوہ کچھ نہیں آتا تھا۔ یہ ہمدردی مشرقی لڑکیوں کی گھٹی میں شامل ہے۔ حبیبہ کا تعلق پاکستان کے چھوٹے سے غریب گھرانے سے تھا اور وہ سکالر شپ پر امریکہ پہنچی تھی۔ اس کے لیے امریکی بود و باش بالکل پریوں کی کہانیوں جیسا تھا:

"پلک جھپکنے کی دیر تھی کہ شر شر شوں شوں کی آواز کے ساتھ سرمے کی طرح باریک
مصالحہ تیار تھا۔
۔۔۔ خیر یہ تو اس مشین کا کمال ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا اس مشین کے متعلق؟
"بس بالکل پریوں کی کہانیوں کی چھڑی ہے جادو کی"۔
"ہاں تو بس اب تیار ہو جاؤ یوں سکھاؤں گا ساری مشین چلانا"۔ "اس نے چٹکی بجائی۔
"میں کیا کروں گی یہ سیکھ کر"۔ اس نے قناعت سے سر جھکا لیا۔
انکل ہم تو پتھر کے سل بٹے پر یا نگری میں پیس لیتے تھے"۔
"تو تم ابھی بھی پتھر ہی کے زمانے میں ہو، حبیبہ"۔ (۵)

دنیا کے ایک حصے میں اس قدر ترقی ہو چکی ہے کہ وہاں کی آسائشوں پر جادو کا گمان ہوتا ہے تو دنیا کے دوسرے حصے میں بسنے والے لوگ ابھی بھی پتھر کے زمانے میں گردانے جاتے ہیں۔ اتنی بڑی ناانصافی کیوں ہے اور ترقی پذیر ممالک کے باشندے احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں اس لیے تو شرمیلے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر نکولس کو اپنی شاگرد وں ویرا اور جینیفر پر افسوس ہوتا کہ یہ اتنی بے لحاظ اور منہ پھٹ ہیں جن کو اپنے استاد کا لحاظ بھی رکھنا نہیں آتا اور حبیبہ ان کے برعکس تھی۔ جینیفر اور ویرا دونوں غیر ملکی ہاشمی اور ہربنس کے عشق میں گرفتار تھیں۔ ڈاکٹر نکولس جو ابھی تک کنوارا تھا۔ ہاشمی اور ہربنس کا نام سن کر اسے انتہائی غصہ آتا کہ اپنے ملک کے مردوں کو چھوڑ کر ہمارے ملک کی عورتیں غیر ملکیوں پر فدا ہیں اور دوسری طرف ویرا اور جینیفر بار بار ڈاکٹر جم نکولس کے منہ سے حبیبہ کا نام سن سن کر غیر ملکی لڑکیوں سے کدورت کا شکار ہو رہی تھیں۔ "بازگشت" افسانے میں الطاف فاطمہ نے ایک اخبار کے ذریعے عالمی ہنگامی صورت حال کو سرخیوں کی مدد سے بیان کیا ہے۔ سماترا، انڈونیشیا کا وہ جزیرہ ہے جہاں دوسری عالمی جنگ میں جاپانیوں نے حملہ کیا تھا۔ وہاں پر انتشار پھیل گیا اور فرانس کی وسط ایشیائی میں تخریب کاری بہت ہی بھیانک تھی۔ تیونس میں فرانس کے مظالم کو "جمیلہ" کی بہادری کے سامنے بے بس دکھایا گیا ہے:

"سماترا کے باغیوں نے نئی حکومت کا اعلان کر دیا تو وہ کیا کریں۔ ماؤماؤ کے آخری لیڈر کی گرفتاری سے ان کو کیا مطلب۔۔۔ اونہہ فرانسیسیوں نے ایک سو بیاسی عرب مار ڈالے تو وہ ماتم کیوں کریں؟"(۶)

تیونس پر بم باری، وہ واقعات ہیں جو آئے دن اخباروں کے ذریعے عام انسان تک پہنچتے ہیں، جن کو وہ سوائے معلومات کے اضافے کے کچھ تبدیل نہیں کر سکتا اور نہ ہی روک سکتا ہے۔ لیکن جمیلہ جیسی جری لڑکی کی تصویر جو مزاحمت کی پاداش میں فرانسیسی سلاخوں کے پیچھے مسکرا رہی تھی، نہ جانے کتنی عورتوں کو باہمت کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ فلسطین، شام، عراق اور افغانستان جیسے فوجی جنگوں کے اڈوں میں عورت کیسے گزر بسر کر رہی ہے۔ اس کے متعلق سوچنا بھی محال ہے۔

بے روزگاری سے تنگ آکر بیرون ملک سفر کرنے والے لوگ وہاں پر بھی بے روزگار ہی رہتے ہیں۔ الطاف فاطمہ کا افسانہ "سلور کنگ" ایسے ہی جفاکش پاکستانی مزدوروں کی کہانی ہے جو دن بھر نوکری تلاش کر کے تھک جاتے اور سلور کنگ جو پاکستانی تھا اور اب بے روزگار تھا، سب اس کو اپنے اپنے دکھڑے سناتے۔ سلور کنگ ان سب سے سینئر تھا۔ وہ کبھی اچھی روزی کما لیتا تھا مگر اب نہ تو ملکہ کا مجسمہ وہاں رہا تھا اور نہ ہی لوگ اُسے دیکھنے آتے۔ یہاں پر جمع ہونے والے مزدوروں کی بے روزگاری کی اپنی ہی ایک کہانی تھی۔ سلور کنگ کو نیٹو سے نفرت تھی مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ نیٹو دراصل کیا ہے۔ اس کے باوجود وہ انگریزوں سے شدید خائف تھا ان سے کبھی بھی وہ ٹپ نہ لیتا تھا۔ بس حق حلال کی جتنی کمائی بنتی اتنی ہی وصول کرتا تھا:

"نامعلوم کونسا جذبہ انتقام اس کی رگ رگ میں لاوے کی طرح کھولتا رہتا تھا، اس کا بس چلتا تو اپنے صاحب لوگوں کو مشورہ دیتا کہ ان نقلی صاحبوں کو صف بہ صف کھڑا کر کے ان کے منہ پر تھوکیں اور بار بار دہرائیں "ذلیل نیٹو"۔(۷)

نیٹو وہ خونی اور درندہ صفت فوجیوں کا اکٹھ ہے جسے امریکہ اور یورپ نے خصوصاً مسلمانوں کے ملکوں کو تہہ و بالا کرنے کے لیے تشکیل دیا تھا اور جس ملک میں وسائل دکھائی دیئے اور ان کے حصول میں رکاوٹ محسوس ہوئی تو بس وہاں نیٹ دوڑا دی۔ اس ملک کو تباہ حال کر کے اس کے وسائل پر قبضہ کر لیا۔ نیٹو دراصل وہ غنڈے ہیں جن کی سرپرستی عالمی ادارے اور عدالت انصاف کرتی ہے اور ان کو معاشی مدد پہنچانے والے وہی شریف اور امن پسند ملک ہیں جنھوں نے دنیا میں بے امنی اور آگ پھیلائی ہوئی ہے۔ سلور کنگ کئی دنوں کے فاقوں کے باعث مر گیا۔ الطاف فاطمہ نے سلور کنگ کے کردار کو نیٹو کے مظالم سے لاعلم رکھ کر غیر متعصب بنایا ہے لیکن برائی اور ظلم کی بو ہر خوشبو اور مکھوٹے سے باہر جھلک پڑتی ہے اس بو کو سلور کنگ سونگھ چکا تھا۔ دنیا کو تباہ کرنے والا خود انسان ہی ہے کوئی خلائی مخلوق یا ایلین نہیں۔ انسان نے اپنے ٹھکانے یعنی زمین کو نیست و نابود کرنے کے لیے ایٹمی بم، ہائیڈروجن اور نیپام بم بنا رکھتے ہیں اور دن بہ دن ایسے ہولناک ہتھیاروں میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ہم دراصل دوسرے ملکوں پر دھاک بٹھانے کی دوڑ میں بنائے جا رہے ہیں۔

الطاف فاطمہ کا افسانہ "اس کا آشوب" ایٹم بموں، فلسطین اور جنگ کے ماحول کو بیان کرتا ہے۔ سب صحافی جس میں فاطمہ بھی شامل ہے۔ ایک ایسے پروگرام میں شامل ہوتے ہیں جس میں ہر صحافی اپنے ملک کے مسائل یا روشن پہلو پر گفتگو کرتے ہیں۔ مورچے، بیم اور جنگی ساز و سامان کے متعلق فاطمہ اور اس کے ساتھیوں نے فوجیوں سے آگاہی حاصل کی۔ پھر مجلس کا انعقاد ہوا جس میں سب سے پہلے تھائی لینڈ سے آئی صحافی نے اپنے ملک کی خوبصورتی کے متعلق سامعین کو مطلع کیا اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر فلسطین سے

آئے حسام الخطیب نے فلسطین میں ہونے والی بربریت پر مقالہ پیش کیا اور ہندوستان سے ملک راج آنند بھی شریک تھے اور کشمیر کا مدعا بھی کسی کی جانب سے اٹھایا گیا۔ ایک قوم دوسری قوم پر بھوک، صعوبتیں، پابندیاں اور جنگ محض جدید جنگی اسلحہ ہونے کی بنا پر کرتی ہے اور ایٹمی، ہائیڈروجن اور نیپایم کی بڑھتی تعداد اس ہوس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

"بڑے بدذات ہوتے ہیں یہ نیپابم"۔ مگر اندر سے بار بار یہی چلی آرہی تھی۔ کون بدذات ہوتا ہے۔ ہم یا بم بنانے والے یا پھر بم باری کا ماحول اور فضا تیار کرنے والے۔(۸)

الطاف فاطمہ نے بہت ہی اہم سوال اٹھایا ہے کہ ایٹم بم ہولناک نہیں بلکہ ان کا استعمال کرنے والے مکروہ اور درندہ صفت لوگ ہیں۔ فلسطین، کشمیر، عراق، افغانستان، تیونس، الجزائر، سماترا وہ علاقے ہیں جہاں پر ایسے ہی خونخوار قانونی دہشت گردی کرنے والے لوگوں کی بربریت برس رہی ہے۔ درندگی کی سب سے بڑی مثال بم ہیں جو انسانی جانوں کو ایک ہی لمحے میں نگل جاتے ہیں۔ اور پیچھے رہ جانے والوں کے لیے کلبلاتے سماج، اس کے ماحول اور اس میں بسنے والوں صحت کو تباہی اور اذیت میں مبتلا کر دیتے ہیں اور ان کے اثرات نہ ختم ہونے والے ہیں۔ یوں بے حس، طاقت ور سرمایہ دار حکمرانوں کی وحشت کے پیچھے آئندہ آنے والی کئی نسلوں کے ذہنوں اور جسموں میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ بربریت اور ظلم کی انتہا کو چھوتی ہوئی اس تباہی کا کوئی پرسان حال نہیں۔

حوالہ جات

1. J. Robert Oppenheimer (Director of the Manhattan Project), Quoting the Bhagavad Gita after Witnessing the first nuclear test.

۲۔ الطاف فاطمہ، ذہن کا اقلیدسی نظریہ، (مشمولہ)، تارِ عنکبوت، لاہور، فیروز اینڈ سنز لمٹیڈ، ۱۹۹۰، ص: ۱۵۷۔۱۵۸

۳۔ الطاف فاطمہ، ذہن کا اقلیدسی نظریہ، (مشمولہ)، تارِ عنکبوت، ص: ۱۵۲

۴۔ ایضاً، ص: ۱۵۹

۵۔ الطاف فاطمہ، وہ جسے چاہا گیا، (مشمولہ)، وہ جسے چاہا گیا، لاہور، فیروز اینڈ سنز لمٹیڈ، ۱۹۶۹ء، ص: ۱۲۔۱۳

۶۔ الطاف فاطمہ، وہ جسے چاہا گیا، (مشمولہ)، وہ جسے چاہا گیا، ص: ۳۵

۷۔ الطاف فاطمہ، سلور کنگ، (مشمولہ)، وہ جسے چاہا گیا، ص: ۷۰

۸۔ الطاف فاطمہ، اس کا آشوب، (مشمولہ)، وہ جسے چاہا گیا، ص: ۱۲۲

References in Roman Script:

1. J. Robert Oppenheimer (Director of the Manhattan Project), Quoting the Bhagavad Gita after Witnessing the first nuclear test.
2. Altaf Fatima, Zehen ka Aqlidsi Nazriya, Mashmola: "Tar e Ankaboot", (Lahore: Feroz & Sons Limited, 1990), P: 157-158.
3. Altaf Fatima, Zehen ka Aqlidsi Nazriya, Mashmola: "Tar e Ankaboot", P: 152
4. Ibid, P: 159

5. Altaf Fatima, Wo Jisay Chaha Gaya, Mashmola: “Wo Jisay Chaha Gaya”, (Lahore: Feroz & Sons Limited, 1969), P: 12-13.
6. Altaf Fatima, Wo Jisay Chaha Gaya, Mashmola: “Wo Jisay Chaha Gaya”, P: 35
7. Altaf Fatima, Silver King, Mashmola: “Wo Jisay Chaha Gaya”, P: 35
8. Altaf Fatima, Us ka Ashob, Mashmola: “Wo Jisay Chaha Gaya”, P: 35